(18)

مسلمانوں کی چار نہایت اہم غلطیاں جو اُن کے سیاسی حقوق و مفادات کے لئے مہلک ثابت ہو رہی ہیں

(فرمودہ 24 مئی 1946ء)

تشہد، تعوّذ اور سورۂ فاتحہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:-

"مجھے پرسوں سے پھر نقرس کا دَورہ ہے اور پاؤں کے علاوہ گھُٹنے میں بھی درد شروع ہو گیا ہے۔ اِس درد کے ازالہ کی تدبیر تو کی جا رہی ہے اور مَیں دوائی استعمال کر رہا ہوں لیکن اِس دوا کے استعمال کے ساتھ ڈاکٹروں نے پچھلے دورہ کے وقت سے یہ ہدایت کی ہوئی ہے کہ مجھے چلنا پھرنا نہیں چاہیئے بلکہ لیٹے رہنا چاہیئے۔ یوں بھی وہ دوا بہت مُضْعِف ہے اور چلنے پھرنے سے خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں دل پر بار نہ پڑ جائے۔ مگر مَیں نے جمعہ کی خاطر یہی پسند کیا کہ مَیں یہاں آؤں اور خطبہ جمعہ اور نماز پڑھاؤں۔

آج جس مضمون کے متعلق مَیں کچھ کہنا چاہتا ہوں وہ ایک حد تک میرے راستہ سے ہٹ کر ہے یعنی بجائے خالص مذہبی مضمون ہونے کے وہ ایک حد تک سیاسی مضمون ہے۔ گو اس کا اثر چونکہ ہماری جماعت کی آئندہ بہبود پر بھی ہے اِس لئے ایک رنگ میں وہ مذہبی بھی ہو جاتا ہے۔

دوستوں کو معلوم ہے کہ گزشتہ ایام میں وزراء کے کمیشن نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی سمجھوتہ کے متعلق ایک فیصلہ شائع کیا ہے۔ یہ فیصلہ مختلف اقوام کے زیر بحث ہے

اور وہ اس میں سے ان اثرات کو اخذ کر رہے ہیں جو ان کی قوموں پر پڑنے والے ہیں۔ جب تک ایک اکثریت کو اقلیت نہ بنا دیا جائے اس وقت تک اکثریت کو تو کوئی خطرہ ہی نہیں ہوتا۔ اکثریت صرف اس بات پر شور مچایا کرتی ہے کہ اس کو اَور زیادہ حقوق مل جائیں۔ یا بعض دفعہ وہ پوری طرح تسلی یافتہ ہوتی ہے مگر پھر بھی وہ اس لئے شور مچاتی ہے کہ کہیں اقلیت اس کے اطمینان کو دیکھ کر بعض اَور مطالبات نہ پیش کر دے۔ اس لئے کانگرس کے لئے تو یہ امر بالکل غیر اہم ہے۔ سو میں سے پچھتّر جن کی تعداد ہو ان کے لئے شور مچانے کی بظاہر کوئی وجہ نہیں ہو سکتی۔ بلکہ پچھتّر کی بجائے اگر بہتّر یا ستّر یا باسٹھ یا ساٹھ فیصدی بھی ان کی تعداد ہوتی تب بھی ان کے لئے خطرہ کی کوئی بات نہیں تھی۔ اصل خطرہ تو اقلیت کے لئے ہوتا ہے کیونکہ وہ جانتی ہے کہ اگر اسے سارے حقوق مل جائیں تب بھی اس کی جان خطرہ سے آزاد نہیں ہو سکتی۔ اگر کسی ملک کی اکثریت پچھتّر فیصدی ہے اور اقلیت پچیس فیصدی اور پچیس فیصدی، اقلیت ایسی ہے جو اکثریت سے اتحاد نہیں رکھتی بلکہ اقلیت اور اکثریت دونوں آپس میں منافرت اور بُغض رکھتی ہیں تو ایسی صورت میں اگر اقلیت کو اس کا ایک ایک حق مل جائے تب بھی پچیس، پچیس ہی ہوں گے اور پچھتّر، پچھتّر ہی ہوں گے۔ بلکہ اگر اکثریت بہت بڑی فیاضی اور مہربانی سے اقلیت کو اس کے حقوق سے بھی زیادہ دے دے اور پچیس کی بجائے اسے تیس یا پینتیس یا چالیس فیصدی نیابت دے دے تب بھی اقلیت کے حقوق کی حفاظت کچھ زیادہ نہیں ہو جاتی۔ کیونکہ کسی اسمبلی کے ساٹھ ممبروں کی رائے بھی وہی وقعت رکھتی ہے جو پچھتّر ممبروں کی رائے وقعت رکھتی ہے۔ بلکہ کسی اسمبلی کے اکیاون ممبروں کی رائے بھی وہی وقعت رکھتی ہے جو پچھتّر ممبروں کی رائے وقعت رکھتی ہے۔ بلکہ بعض صورتوں میں تو یوں کہنا چاہئے کہ کسی اسمبلی کے سَوا پچاس ممبروں کی رائے بھی وہی وقعت رکھتی ہے جو سَو میں سے پچھتّر ممبروں کی رائے وقعت رکھتی ہے۔ سَو میں سے سَوا پچاس ممبر تو ایک طرف نہیں ہو سکتے۔ لیکن اگر کسی اسمبلی کے ممبر چار سَو ہوں تو اس کا سوا پچاس حصہ دو سَو ایک ممبر ہو جائیں گے اور دو سَو ایک ممبر بھی اسی طرح ایک سَو ننانوے کو شکست دے سکتا ہے جس طرح تین سَو شکست دے سکتا ہے۔ تو اکثریت کے لئے خطرہ کا کوئی سوال ہی نہیں ہوتا۔ اکثریت اگر شور مچاتی ہے تو یا تو وہ حریص ہوتی ہے

اور زیادہ طلبی عادتاً اختیار کر لیتی ہے یا اکثریت ڈرپوک ہوتی ہے اور اسے جو کچھ ملے اس پر وہ مطمئن نہیں ہوتی بلکہ ڈرتی ہے کہ نہ معلوم آئندہ کیا ہو جائے۔ یا اس کے نتیجہ میں مجھے کسی وقت کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ اور یا پھر اکثریت ہوشیار ہوتی ہے اور وہ محض ڈرانے کے لئے تاکہ اقلیت کچھ اور حقوق نہ مانگنے لگ جائے، شور مچانے لگ جاتی ہے۔ اِن وجوہ کے سوا اکثریت کے شور مچانے کی اور کوئی وجہ نہیں ہوتی۔ پس جہاں تک کانگرس کے لیڈروں کا سوال ہے مَیں حیران ہوں کہ وہ کس خیال میں ہیں۔ اگر وہ ناتجربہ کار ہوتے تو مَیں سمجھتا کہ وہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں مگر وہ ناتجربہ کار نہیں بلکہ اچھے سیاستدان ہیں۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ وہ اتنی موٹی بات بھی نہ سمجھ سکیں کہ ہمارے حقوق بہر حال محفوظ ہیں۔ لیکن جہاں تک مسلم لیگ کا سوال ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلم لیگ کی حیثیت اس فیصلہ کے مطابق بہت کچھ گر گئی ہے کیونکہ جن باتوں کا انہوں نے مطالبہ کیا تھا وہ باتیں ان کو حاصل نہیں ہوئیں۔ اگر وہ اُن کا کم سے کم آخری مطالبہ تھا تو یہ کہنا پڑتا ہے کہ مسلم لیگ کو اس کا کم سے کم مطالبہ حاصل نہیں ہوا۔ اور اگر وہ ان کا زیادہ سے زیادہ مطالبہ تھا تو پھر بے شک مسلم لیگ کے لئے یہ سوچنے کا موقع ہے کہ اس کے مطالبات اور موجودہ فیصلہ میں کتنی کمی ہے۔ اور آیا اس کمی کے ہوتے ہوئے وہ اس فیصلہ کو قبول کر سکتی ہے یا نہیں۔

جہاں تک مَیں نے اس سکیم پر غور کیا ہے میرے نزدیک اس میں یقیناً ایسی خامیاں ہیں جن خامیوں کے ہوتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق پوری طرح محفوظ نہیں رہ سکتے۔ یا یہ کہو کہ اس وقت ملک کی جیسی فضا ہے اور ایک دوسرے کے خلاف جو خیالات لوگوں کے دلوں میں پائے جاتے ہیں ان کو مدنظر رکھتے ہوئے مسلمانوں کے حقوق پوری طرح محفوظ نہیں ہو سکتے۔ ورنہ اگر آپس میں بھائی چارہ ہو، ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے محبت اور پیار رکھتے ہوں اور دوسرے کے دکھ کو اپنا دکھ اور دوسرے کے سُکھ کو اپنا سُکھ سمجھتے ہوں تو پھر یہ سوال ہی نہیں رہتا کہ مسلمانوں کو پچیس فیصدی نمائندگی کیوں ملی ہے۔ آدھی نمائندگی کیوں نہیں ملی۔ بلکہ مَیں کہتا ہوں اگر اس قسم کی محبت پیدا ہو جائے اور پھر مسلمانوں کو کچھ بھی ملے تب بھی کوئی حرج نہیں۔ اگر آپس میں رواداری پائی جاتی ہو، ایک دوسرے سے محبت اور پیار قائم ہو،

بُغض اور تنافر کا دلوں میں نشان تک نہ پایا جاتا ہو، تو پھر پچیس فیصدی کیا ایک فیصدی کا بھی کوئی سوال نہیں رہتا۔ اقلیت بڑی خوشی سے اکثریت کو کہہ سکتی ہے کہ آپ ہمارے نمائندے ہیں آپ جو چاہیں فیصلہ کر دیں ہمیں منظور ہے۔ خرابی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ملک کی ذہنیت اس قسم کی نہیں۔ ابھی تک وہ باتیں سیاست کی کرتے ہیں مگر سوچتے مذہب کے اثر کے ماتحت ہیں۔ ہر لفظ جو ان کے منہ سے نکلتا ہے سیاسیات میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے لیکن ہر فکر جو ان الفاظ کے پیچھے کام کر رہا ہوتا ہے وہ خالص مذہبی ہوتا ہے۔ گویا ایک دوغلی سی کیفیت ہمارے ملک میں پیدا ہو چکی ہے۔ اور لوگوں کی ویسی ہی مثال ہے جیسے پرانے زمانہ میں بَنیے آپس میں لڑا کرتے تھے۔ ہم نے خود اس قسم کی بَنیوں کی لڑائی دیکھی ہے۔ بَنیا چونکہ تاجر پیشہ ہوتا ہے، بہادری کی روح اس میں نہیں ہوتی، جب لڑائی ہوتی ہے تو ایک بھی پنسیری اُٹھالیتا ہے اور دوسرا بھی۔ ایک شخص گالی دیتا ہے تو دوسرا پنسیری اٹھائے کُودنے لگ جاتا ہے اور کہتا ہے اب کے گالی دے تو مَیں اس پنسیری سے تیرا سر پھوڑ دوں گا۔ وہ پھر گالی دیتا ہے تو یہ پھر کُود کر کہتا ہے اب کے گالی دے تو تجھے مزا چکھاؤں۔ اس طرح ایک گالیاں دیتا جاتا ہے اور دوسرا یہی کہتا رہتا ہے کہ اب کے گالی دے تو تجھے بتاؤں کہ کس طرح گالی دی جاتی ہے۔ دو منٹ کے بعد پہلا شخص پھر اشتعال میں آکر گالی دے دیتا ہے اور یہ پنسیری اٹھا کر پھر کُودنے لگ جاتا ہے اور کہتا ہے اگر اب کی دفعہ گالی دی تو تیرا سر پھوڑ دوں گا۔ مَیں نے دیکھا ہے کہ ایسی حالت میں بعض دفعہ ایک شخص اشتعال میں آکر آگے کی طرف بڑھتا ہے تو دوسرا شخص کود کر فوراً پیچھے ہٹ جاتا ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا جاتا ہے کہ اب کے گالی دے تو تجھے مزہ چکھاؤں۔ اس قسم کا نظارہ سخت تکلیف دِہ ہوتا اور اخلاق کی گراوٹ پر دلالت کیا کرتا ہے۔ ہمارے ملک کی دو بڑی قومیں ہیں اور جہاں تک انصاف کا سوال ہے، جہاں تک عقل کا سوال ہے وہ دونوں سیاست کے لحاظ سے ایک دوسری سے متحد ہو سکتی ہیں۔ مگر جب ذہنیت اس قسم کی ہو کہ ایک نے بھی پنسیری اٹھائی ہوئی ہو اور دوسرے نے بھی پنسیری اٹھائی ہو اور جب ان میں سے ایک شخص حملہ کے لئے آگے بڑھنے لگے تو دوسرا شخص یہ سوچ رہا ہو کہ مَیں اب کود کر کتنا پیچھے ہٹوں گا۔ تو ایسی حالت میں آپس میں کہاں اتحاد ہو سکتا ہے۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ منہ سے تو سیاست کی

باتیں کی جاتی ہیں مگر ان باتوں کے پس پردہ مذہب کا اثر غالب ہوتا ہے اور جب کیفیت یہ ہو تو اس کا کیا علاج ہو سکتا ہے۔ سننے والوں میں سے ناواقف لوگ بے شک دھوکا کھا جائیں گے اور وہ سمجھیں گے کہ یہ سیاست کی باتیں ہو رہی ہیں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ محض سیاسی باتیں نہیں بلکہ مذہبی تعصب بھی ان کے دلوں پر اثر ڈال رہا ہے۔ ان حالات میں ملک کے لئے جو خطرات پیدا ہو سکتے ہیں وہ ظاہر ہیں۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی تھی کہ مسلمان واقع میں مسلمان ہوتے۔ اگر مسلمان واقع میں مسلمان ہوتے تب بھی ان کے لئے ڈرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ جو قوم مرنے کے لئے تیار ہو جاتی ہے اس قوم کو کبھی کوئی مار نہیں سکتا۔ مسلمان اپنے متعلق کہتے ہیں ہم دس کروڑ ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دعویٰ صحیح ہے اور وہ واقع میں دس کروڑ ہی ہیں۔ لیکن مَیں کہتا ہوں دس کروڑ نہیں۔ اگر مسلمان پانچ کروڑ ہوتے بلکہ مَیں کہتا ہوں پانچ کروڑ بھی نہیں اگر مسلمان دو کروڑ ہوتے بلکہ دو کروڑ بھی نہیں، اگر مسلمان ایک کروڑ بھی ہوتے تب بھی اُنتالیس کروڑ آدمی کبھی اِن پر جابرانہ حکومت نہیں کر سکتے تھے۔ سوال صرف اس بات کا ہوتا ہے کہ کیا لوگ اپنی زندگی کو زیادہ قیمت دیتے ہیں یا اپنے اصول کو زیادہ قیمت دیتے ہیں؟ جس قوم کے لوگ اپنے اصول کو زیادہ قیمت دیتے ہیں اُس قوم کو کوئی مار نہیں سکتا۔ اور جس قوم کے لوگ اپنی زندگی کو زیادہ قیمت دیتے ہیں اس قوم کو کوئی بچا نہیں سکتا۔ ہمارے ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف سے پاکستان کا شور مچایا جاتا رہا ہے مگر اس تمام شور کے باوجود خود مسلمانوں میں سے ہی ایک طبقہ ہمیشہ خریدا جاتا رہا ہے۔ ہندوستان کا کوئی صوبہ بھی تو ایسا نہیں جس میں کونسل کے ممبر یا باہر کے مسلمانوں میں سے کچھ خریدے نہ گئے ہوں۔ آخر یہ فرق کیوں ہے؟ کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ فرق اس لئے ہے کہ مسلمانوں کے اخلاق کمزور ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے اپنے اخلاق کمزور ہیں تو پھر کمزور اخلاق والوں کو کونسا قانون بچا سکتا ہے۔

میرے نزدک جو غلطی ابتدا میں ہی مسلم لیگ سے ہوئی وہ یہ تھی کہ صرف سیاسی حقوق کی حفاظت اصل چیز سمجھ لی گئی اور وہ اصولی چیزیں جو کسی قوم کو بچایا کرتی ہیں

مسلمان لیڈروں نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہندوؤں کا بھی پہلے یہی حال تھا مگر گاندھی جی نے اِس میں تغیر پیدا کیا۔ ورنہ پہلے کانگرس بھی صرف سیاسیات کا شور مچایا کرتی تھی۔ گاندھی جی نے اِس نقص کو دیکھا اور انہوں نے سمجھا کہ خالص سیاسی شور کوئی چیز نہیں اصل چیز قومی کیریکٹر ہے۔ تم فوج چاہے کتنی بھرتی کر لو لیکن اگر سپاہیوں میں بہادری کی روح نہیں تو وہ فوج تمہارے کس کام آ سکتی ہے۔ ہمارے ملک میں ایک لطیفہ مشہور ہے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ وہ کس حد تک درست ہے مگر کہتے ہیں مہاراجہ کشمیر نے ایک دفعہ کشمیریوں کی ایک فوج تیار کی۔ لڑائی کا وقت آیا تو انگریزی حکومت نے مہاراجہ صاحب کشمیر کو لکھا کہ آپ بھی اپنی فوج لڑنے کے لئے بھجوائیں۔ مہاراجہ کشمیر نے فوج کے افسر کو بلایا اور اُسے کہا سرحد پر فوج کی ضرورت ہے تمہاری فوج کو جانے کا حکم دیا جاتا ہے۔ افسر نے کہا مَیں سپاہیوں کو حکم سے اطلاع دیتا ہوں۔ سپاہیوں کو اطلاع دے کر وہ پھر آیا اور مہاراجہ صاحب سے کہنے لگا۔ ہم آپ کے نمک خوار ہیں اور ہم لڑنے کے لئے بالکل تیار ہیں۔ آخر ہم تنخواہ کس بات کی لیتے رہے ہیں لیکن حضور! رعایا کی صرف اِس قدر عرض ہے کہ ہم نے سنا ہے کہ پٹھان بڑے سخت ہوتے ہیں۔ اگر ہمارے ساتھ پہرہ کا انتظام ہو جائے تو ہم جانے کے لئے حاضر ہیں۔ اب چاہے لطیفہ ہی ہو مگر لطائف بھی تو حقائق کے بیان کرنے کا موجب ہو جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بغیر اخلاق کے کوئی قوم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بغیر جرأت کے کوئی فوج لڑ نہیں سکتی اور بغیر قومی کیریکٹر قائم کرنے کے کوئی قوم دوسری پر غالب نہیں آ سکتی۔ گاندھی جی نے اس نکتہ کو سمجھا اور انہوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ دنیا میں سیاسیات کا شور مچانا شروع کر دیا بلکہ قومی کیریکٹر کو مضبوط کرنے کے لئے بھی اُنہوں نے کئی قسم کی تدابیر سے کام لیا۔ مثلاً اسی چیز کو لے لو کہ انہوں نے اپنی قوم کو چرخہ کاتنے پر لگا دیا۔ اب بظاہر یہ ایک لغو بات ہے اور ہے بھی لغو، مگر گاندھی جی نے جس غرض کے ماتحت اس طریق کو رائج کیا تھا وہ ایک نہایت ہی اعلیٰ غرض تھی اور اس کے لحاظ سے انہوں نے یہ لغو کام نہیں کیا بلکہ قوم کے کیریکٹر کو مضبوط بنانے کے لئے ایک شاندار کام کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ مَیں جن لوگوں کو انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے لئے تیار کرنا چاہتا ہوں وہ رات اور دن انگریزوں کی غلامی میں

اپنی زندگی بسر کر رہے ہیں اور خواہ تقریروں میں وہ یہی کہتے کہ ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال دیں گے، ہم ایک منٹ کے لئے بھی انگریزوں کی غلامی برداشت نہیں کریں گے مگر انگریز کی غلامی ان کی ذہنیت پر اس قدر غالب ہوتی کہ وہ ٹائی لے کر گھنٹوں شیشہ کے آگے کھڑے رہتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ٹائی یوں تو نہیں ہو گئی یاؤوں تو نہیں ہو گئی۔ اب ٹائی کا یوں ہونا یاؤوں ہونا کس اثر کا نتیجہ تھا؟ یقیناً انگریز کی غلامی کے اثر کا نتیجہ تھا۔ کیونکہ ہمارے باپ دادا نے تو کبھی ٹائی نہیں لگائی تھی۔ پھر وہ ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ ہمارے کوٹ کے کپڑے کا رنگ اور ہماری ٹائی کا رنگ آپس میں مخالف تو نہیں۔ یہ قانون آخر کس کا تھا کہ کوٹ اور ٹائی کا رنگ آپس میں مخالف نہیں ہونا چاہئے؟ یقیناً انگریز کا تھا۔ ورنہ ہمارے باپ دادا تو نہ سوٹ پہنا کرتے تھے اور نہ ٹائی وغیرہ لگایا کرتے۔ پھر وہ ہمیشہ اس امر کو اپنے مدنظر رکھتے کہ ہمارے رومال اور ہمارے بُوٹ اور ہمارے بٹن اور ہمارے کالر ایٹی کیٹ(Etiquette) کے مطابق ہیں یا نہیں۔ گاندھی جی نے اس حالت کو دیکھا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ مَیں ان لوگوں کو بالکل دوسری جانب لے جاؤں۔ جس کی شکل موجودہ شکل سے بالکل مختلف ہے۔ چنانچہ یا تو ایک ہندوستانی خالص انگریز یا خالص جرمن بن رہا تھا اور یا پھر انہوں نے اسے بڑھیا بنا کر چرخہ کاتنے کی طرف متوجہ کر دیا۔ انہوں نے کہا مَیں لوگوں سے یہ کیا جھگڑا کرتا پھروں کہ تم اِس بات کی کوئی پروا نہ کرو کہ تمہاری ٹائی کا رنگ سرخ ہے یا سفید۔ یا تمہاری ٹائی اِدھر جاتی ہے یا اُدھر۔ یا تمہارے بُوٹ کو پالش کیا ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا مجھے اس بحث سے کوئی غرض نہیں۔ آؤ مَیں ان کو ایک اُلٹ راستے پر لے چلوں تا کہ انگریز کی غلامی کا خیال بھی ان کے دلوں سے نکل جائے۔ چنانچہ جس طرح ایک انگریز ٹائی کے پیچھے پڑا ہوا تھا انہوں نے ایک ہندوستانی کو سُوت کاتنے پر لگا دیا اور اسے کہہ دیا کہ تم سارا دن بیٹھے چرخہ چلاؤ اور چُوں چُوں کی آواز نکالتے رہو۔ انہوں نے سمجھا کہ جو شخص میری اس سکیم پر عمل کرے گا انگریزی فیشن کی پابندی کو وہ خود بخود ترک کر دے گا۔ اور آپ ہی آپ سُوٹ اتار کر پھینک دے گا ورنہ یہ ایک عجیب مضحکہ انگیز صورت بن جائے گی کہ سوٹ پہنا ہوا ہے، ٹائی لگائی ہوئی ہے اور زمین پر بیٹھے چرخہ چلا رہے ہیں۔ پس گاندھی جی نے صرف سیاسی حقوق کے متعلق اپنی قوم کی آواز بلند نہیں کی

بلکہ انہوں نے ان کی غلامی کی ذہنیت بدلنے کے لئے بھی کئی قسم کی تدابیر سے کام لیا۔ جیسے چرخہ کاتنے کی تحریک لوگوں کی اخلاقی ذہنیت بدلنے کا ایک ذریعہ تھی۔ اسی طرح انہوں نے کھدر بھنڈار جاری کیا۔ گو بعض کانگرسیوں نے بھی کمال کر دیا کہ انہوں نے کھدر کے سُوٹ اور کوٹ پتلون بنوا کر پہننے شروع کر دیئے۔ مگر گاندھی جی کا یہ منشاء نہیں تھا۔ گاندھی جی کا اصل منشاء کھدر بھنڈار سے یہی تھا کہ کسی طرح انگریزوں کی نقل اور ان کی غلامی کا مادہ ہندوستانیوں کے دلوں میں سے نکل جائے۔ اسی طرح انہوں نے اور بھی کئی قسم کی تدابیر کیں اور صرف سیاسیات کی طرف اپنی توجہ مبذول نہیں رکھی بلکہ اخلاقیات کی طرف بھی انہوں نے اپنی توجہ مبذول کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج کانگرس کو جو طاقت حاصل ہے وہ طاقت اسے پہلے حاصل نہیں تھی۔ پہلے وہ صرف سیاسی شور مچایا کرتے تھے مگر اب انہوں نے اپنے اخلاق میں بھی ایک تبدیلی پیدا کرلی ہے۔ مگر افسوس کہ مسلمانوں نے کانگرس کے اس طریقِ عمل سے کوئی سبق حاصل نہ کیا۔ مسلمان گزشتہ کئی سال سے صرف سیاسی شور مچارہے ہیں۔ اپنی اخلاقی اور تمدنی اصلاح کی طرف انہوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ گاندھی جی نے صرف سیاسی شور نہیں مچایا بلکہ لوگوں کی تمدنی اصلاح کی بھی کوشش کی اور کھدر بھنڈار جاری کر دیئے۔ وہ جانتے تھے کہ میرے چیلے جو میری اطاعت کرنے والے ہیں وہ کھدر بھنڈار سے سبق حاصل کر کے اقتصادی سکیم کی طرف متوجہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ برلا وغیرہ نے سبق سیکھا اور انہوں نے اپنی قوم کو بہت بڑا فائدہ پہنچایا۔ اسی طرح کانگرس کے دوسرے ممبر جو کھدر بھنڈار کے مخالف تھے اور اسے ایک لغو کام سمجھتے تھے انہوں نے بھی اپنی توجہات اقتصادی تنظیم کی طرف پھیر دیں اور ہندو قوم کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جن سے ایک قوم نیچے سے اوپر چلی جاتی ہے مگر مسلمانوں کی غفلت کا یہ نتیجہ ہے کہ ان کی طرف سے ہمیشہ سیاسی شور مچایا جاتا رہا لیکن کبھی بھی ان امور کی طرف انہوں نے توجہ نہیں کی جو قوم کی حقیقی کامیابی کے لئے ضروری تھے۔ یہ شور تو مچایا جاتا رہا کہ پاکستان، پاکستان، پاکستان۔ مگر یہ کبھی خیال نہیں کیا گیا کہ مسلمان کے اندر جرأت اور بہادری پیدا کی جائے، ان کی اخلاقی حالت کی درستی کی کوشش کی جائے، ان کی اقتصادی حالت کی درستی کی کوشش کی جائے اور ایسے حالات پیدا کئے جائیں کہ ان

کی غلامی کی روح بالکل کچلی جائے۔ ایک ہندو انگریز کا جس قسم کا غلام تھا۔ آج اس سے وہ بہت کم غلام ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ وہ انگریز کی غلامی سے بالکل آزاد ہو گیا ہے مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ انگریز کی غلامی سے بہت حد تک نکل چکا ہے اور اب پہلے کی نسبت وہ بہت کم غلامی کی روح اپنے اندر رکھتا ہے۔ لیکن ایک مسلمان ابھی انگریز کا ویسا ہی غلام ہے جیسے پہلے تھا بلکہ شاید اس میں غلامی کی روح اب کچھ زیادہ ہی ہو گئی ہو۔ ان امور کی اصلاح ضروری تھی مگر ان کی طرف توجہ نہیں کی گئی حالانکہ ان کے بغیر کبھی کوئی قوم کامیاب نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے۔

جب کسی قوم کی اخلاقی حالت گر جائے تو وہ لالچ اور فریب اور دھمکیوں سے بہت جلد متاثر ہو جاتی ہے اور جب تک مسلمانوں کے اندر یہ نقص موجود رہے گا کہ وہ دھمکیوں سے مرعوب ہو جائیں گے وہ لالچ اور حرص کا مقابلہ کرنے کی طاقت اپنے اندر نہیں پائیں گے۔ اس وقت تک ان کی ترقی کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ الیکشن کے موقع پر مسلمانوں میں بہت بڑا جوش پایا جاتا تھا اور انہوں نے اس جوش کا عملی مظاہرہ بھی کیا۔ مگر مسلمانوں کا جوش ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ گزشتہ بیس سال میں مسلمانوں نے اتنے پلٹے کھائے ہیں کہ ان کو دیکھتے ہوئے ان کے کسی جوش کو کوئی اہمیت ہی نہیں دی جا سکتی۔ وہ بڑے جوش سے ایک کام کا آغاز کرتے ہیں مگر ذرا بھی ان کو لالچ دے دیا جائے تو ان کا تمام جوش و خروش سرد ہو جاتا ہے اور وہ اپنے پہلے طریق کے بالکل خلاف چلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اَور تو اَور مسلم لیگ کے کئی ممبر جن سے ہمارا تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے۔ وہ بھی بعض دفعہ چھوٹی چھوٹی شکایتوں کی بناء پر اپنی پارٹی بدلنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان میں سے بعض کو ہمیں سمجھانا پڑتا ہے کہ یہ طریق تمہارے لئے مناسب نہیں۔ اس قسم کے حالات میں اگر کوئی قوم مقابلہ کے لئے کھڑی ہو تو کس طرح ہو۔ آخر وہ کونسے ہتھیار ہوں گے جن سے جنگ کی جائے گی جبکہ وہ اخلاقی طور پر غالب نہیں اور جبکہ وہ ہر جگہ خریدے جا سکتے ہیں۔

دوسری چیز یہ تھی کہ مسلمانوں کی آواز کو غیر ممالک کے لوگوں تک پہنچایا جاتا اور ان پر مسلمانوں کے مطالبات کی اہمیت کو واضح کیا جاتا۔ مگر اس بارہ میں بھی بہت بڑی غفلت سے کام لیا گیا اور مسلمانوں کی آواز کو صحیح طور پر بیرونی ممالک کے لوگوں تک پہنچایا ہی نہیں گیا۔

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ ہندو ہندوستان میں اپنی آواز بلند کرتے ہیں لیکن امریکہ میں بھی اگر کوئی مضمون نکلتا ہے تو ہندوؤں کی تائید میں، مسلمانوں کی تائید میں نہیں نکلتا۔ انگلستان کے اخبارات میں بھی اگر مضامین شائع ہوتے ہیں تو ننانوے فیصدی ہندوؤں کی تائید میں ہوتے ہیں۔ پھر امریکہ اور انگلستان کا ذکر جانے دو اپنے گھر میں یعنی فلسطین، شام اور مصر میں بھی جب مضامین نکلتے ہیں تو ان میں اکثر ہندوؤں کی تعریف میں ہوتے ہیں۔ ٹرکی میں بھی اگر مضامین نکلتے ہیں تو اکثر ہندوؤں کی تائید میں ہوتے ہیں۔ آخر وجہ کیا ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کے خلاف رائے رکھتا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ انہوں نے پروپیگنڈا کی قیمت کو سمجھا اور ہر جگہ اپنے نمائندے بھجوائے لیکن مسلمانوں نے پروا نہیں کی۔ وہ اس خیال میں مست رہے کہ بس ہم جو بھی ارادہ کریں گے اسے پورا کر کے رہیں گے۔ ہمیں اس بات کی پروا نہیں کہ دنیا کی رائے ہمارے مخالف ہے یا موافق۔ سیدھی بات ہے کہ دنیا کی رائے بڑی بھاری اہمیت رکھتی ہے۔ ہماری زبان میں مثل مشہور ہے کہ اگر تم کسی انسان کو کُتّا کہنا شروع کر دو تو تھوڑے دنوں کے بعد ہی لوگ اسے کُتّا سمجھنا شروع کر دیں گے۔ اگر کسی کو بُرا کہو تو اسے بُرا کہنے لگ جائیں گے۔ اچھا کہو تو اچھا کہنے لگ جائیں گے۔ چونکہ ہر ملک میں ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کیا اس لئے آج یہ حالت ہے کہ ایک مسلمان بھی دوسرے مسلمان کے خلاف رائے رکھتا ہے۔ اور ہر ملک میں گاندھی جی یا کانگرس کی تائید میں ہی آواز اٹھتی ہے۔ اگر مسلمانوں کی تائید میں کوئی آواز اٹھتی ہے تو وہ اول تو بہت محدود ہوتی ہے اور پھر کبھی بھی وہ اس جوش و خروش سے بلند نہیں ہوتی جس جوش و خروش سے کانگرس کی تائید میں آواز بلند ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک بڑی بھاری کمزوری تھی جس کی وجہ سے آج کمیشن بڑی دلیری سے مسلمانوں کے حقوق کو تلف کرنے کے لئے تیار ہو گیا کیونکہ وہ جانتا ہے کہ دنیا کی آواز میری تائید میں ہے۔ لیکن اگر ہندو کے حقوق کو مَیں نے تلف کیا تو ساری دنیا میں میرے خلاف شور مچ جائے گا۔

تیسری چیز یہ ہے کہ ساری دنیا میں سیاسی جھگڑے ہیں لیکن مذہبی جھگڑے صرف چند ملکوں میں ہیں جن میں سے ایک ہندوستان بھی ہے۔ اس وجہ سے دوسری دنیا سیاسی جھگڑے

سننے کے لئے تو تیار ہو جاتی ہے لیکن مذہبی جھگڑے کا اگر اس کے پاس ذکر کیا جائے تو وہ اس کے سننے کے لئے تیار نہیں ہوتی۔ ایک امریکہ کا آدمی یہ محسوس بھی نہیں کر سکتا کہ مذہبی اختلاف کی وجہ سے کوئی قوم دوسری قوم پر ظلم کر سکتی ہے۔ایک انگلستان کا آدمی یہ محسوس بھی نہیں کر سکتا کہ مذہبی اختلاف کبھی ایسی خطرناک صورت اختیار کر سکتا ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے مظالم کا تختۂ مشق بنالے۔ ایک فرانس کا آدمی یہ کبھی خیال بھی نہیں کر سکتا کہ مذہبی اختلافات بھی اس قابل ہیں کہ ان کی اہمیت کو محسوس کیا جائے۔ یہی حال اَور ممالک کا ہے اِلَّا مَا شَاءَ اللّٰہ کہ ان میں سے کوئی ملک بھی مذہبی جھگڑوں کو کسی قسم کی اہمیت نہیں دیتا۔ اسی لئے جب کبھی کوئی سیاسی مسئلہ ان کے سامنے آتا ہے تو دوسری قوموں کے سیاست دان صرف اس نقطۂ نگاہ سے اس پر غور کرتے ہیں کہ ڈیما کریسی یعنی جمہوریت کے اصول کے مطابق اس مسئلہ کی کیا قیمت ہے۔ جو مسئلہ جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے انہیں صحیح معلوم ہوتا ہے اس کی وہ تائید کر دیتے ہیں اور جو مسئلہ جمہوریت کے نقطۂ نگاہ سے انہیں صحیح معلوم نہیں ہوتا اس کو وہ رد کر دیتے ہیں۔ مثلاً جمہوریت کہتی ہے کہ اگر کسی ملک کے چار آدمی ہوں تو ان میں سے تین جو کچھ کہیں گے وہ درست ہو گا۔ اور ایک شخص جو کچھ کہے گا وہ درست نہیں ہو گا۔ چونکہ ہندوستان میں مسلمان ایک ہے اور ہندو تین۔ اس لئے امریکہ جب مسلمانوں کی آواز کو سنتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ بالکل فضول مطالبہ ہے۔ ہندو جو کچھ کہتے ہیں وہ درست ہے۔ اسی طرح انگلستان والا جب سنتا ہے کہ مسلمان کہتے ہیں کہ ہمارے مطالبات مانے جائیں تو وہ ہنستے ہوئے کہتا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے ہم ایک کی بات مانیں یا تین کی بات مانیں۔ تین کے مقابلہ میں ایک کا آواز اٹھانا تو بیوقوفی ہے۔ اور اگر اس کو تسلیم کر لیا جائے تو یہ ڈیما کریسی نہ رہی بلکہ بادشاہت ہو گئی۔ یہی حال فرانس والوں کا ہے۔ وہ بھی جب مسلمانوں کے حالات سنتے ہیں تو جمہوریت کے اصول کے مطابق وہ ہندوؤں کی تائید کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ مذہبی نقطۂ نگاہ ان کے نزدیک کسی توجہ کے قابل نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے اپنے ملک میں مذہب کو اس طرح نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ مذہب کا کوئی احساس بھی ان کے دلوں میں نہیں رہا۔ اور چونکہ وہاں مذہبی اختلاف کی وجہ سے کوئی قوم دوسری قوم پر ظلم نہیں کرتی۔ اس لئے جب مسلمان مذہبی اختلاف کی بناء پر

اپنے خدشات ان کے سامنے بیان کرتے ہیں تو وہ مان ہی نہیں سکتے کہ مسلمانوں کو کوئی حقیقی خطرہ درپیش ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ انگریزی حکومت کو لمبا کرنے کے لئے بعض افسر ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑاتے رہتے ہیں۔ اور تو اَور خود انگلستان میں ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں بڑے زور سے یہ بات بیان کی گئی ہے کہ ہمارے آئی۔ سی۔ ایس ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑواتے رہتے ہیں تاکہ ہماری حکومت لمبی ہو جائے اور کئی انگریز بڑی دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ محض ہمارے افسروں کی شرارت کا نتیجہ ہے ورنہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کونسا جھگڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن کانگرس جب اپنی آواز بلند کرتی ہے تو اس کا غیر ممالک پر نمایاں اثر ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے ہم ہندوؤں کے نمائندہ نہیں اور جب وہ کہتی ہے کہ ہم ہندوؤں کے نمائندہ نہیں تو دوسرے الفاظ میں دنیا پر یہ اثر ڈالا جاتا ہے کہ ہمارے ہاں ہندو مسلم کوئی سوال نہیں۔ پھر کانگرس نے ہوشیاری یہ کی کہ پریذیڈنٹ مولانا ابوالکلام آزاد کو بنا دیا۔ اسی طرح سیکرٹری وغیرہ عہدوں پر بعض مسلمان مقرر کر دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب بھی کانگرس کے کسی کام کی رپورٹ دنیا کے سامنے جاتی ہے تو اس میں لکھا ہوتا ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور مسٹر راجندر پرشاد نے فلاں کام کیا۔ اس کا طبعی طور پر لوگوں پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ سمجھتے ہیں اس میں ساری قومیں شامل ہیں۔ ہندو بھی شامل ہیں، مسلمان بھی شامل ہیں، سکھ بھی شامل ہیں۔ پھر مسلمان کس طرح کہتے ہیں کہ یہ محض قومی آرگنائزیشن ہے۔ لیکن مسلمانوں نے شروع سے اس کے خلاف طریقِ عمل رکھا۔ انہیں چاہئے تھا کہ غیر قوموں سے بھی میل جول رکھتے۔ ہندوستان میں ہزاروں نہیں لاکھوں لاکھ ہندو ایسے ہیں جو حقیقی معنوں میں اپنی قوم سے دُکھیا ہیں۔ اگر ان کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی جاتی تو آج نتیجہ بالکل اَور نکلتا۔ مثلاً مسلم لیگ کی بجائے نیشنل لیگ بنا لیتے اور اس کے اصول اس قسم کے رکھتے جن کا طبعی نتیجہ مسلمانوں کے حق میں نکلتا جس طرح کانگرس نے اپنے اصول ایسے رکھے ہیں جن کا طبعی نتیجہ ہندوؤں کے حق میں نکلتا ہے۔ تو ہر دیکھنے والا سمجھتا کہ یہ کوئی مذہبی جماعت نہیں بلکہ ایک سیاسی جماعت ہے جو تمام کمزور طبقوں کی حفاظت کا کام سرانجام دینے کے لئے کھڑی ہوئی ہے اور اس کے دل میں بھی خواہش پیدا ہوتی کہ مَیں اس میں شامل ہو جاؤں۔ اسی طرح

مسلم لیگ اگر اس رنگ میں کام کرتی کہ اس نے مظلوموں کو فائدہ پہنچانا ہے تو بے شک اَور قوموں کو بھی فائدہ پہنچتا مگر مسلمان چونکہ سب سے زیادہ مظلوم تھے اس لئے ان کو اَوروں سے زیادہ فائدہ پہنچتا۔ اگر ان اصول کے مطابق کام کیا جاتا تو اس انجمن میں کئی ہندو بھی شامل ہو جاتے، کئی سکھ بھی شامل ہو جاتے اور اچھوت اقوام میں سے تو لاکھوں لوگ اس میں شامل ہو جاتے لیکن مسلمان لیڈروں نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ وہ ہمیشہ دوسروں سے الگ ہو کر کام کرتے رہے۔ حالانکہ اگر وہ دوسری قوموں کو بھی اپنے ساتھ شامل کرتے تو آج ان کے پاس ایک بہت بڑی فوج ہوتی۔ ہندوؤں نے اس راز کو سمجھا اور انہوں نے ایک ایک کر کے تمام قوموں کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ ایک طرف اچھوتوں کو انہوں نے اپنے ساتھ ملایا دوسری طرف مسلمانوں میں سے بعض لوگوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ تیسری طرف سکھوں کو اپنے ساتھ ملایا۔ چوتھی طرف اینگلو انڈینز (Anglo Indians) اور کرسچینز (Christians) کو اپنے ساتھ ملایا اور اس طرح متحدہ طور پر اپنے مطالبات کو انگریزوں کے سامنے رکھا۔ مسلمانوں کو سوچنا چاہیئے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ عیسائی اٹھتے ہیں تو ان کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، اچھوت اٹھتے ہیں تو باوجود اس کے کہ وہ شور مچاتے رہتے ہیں کہ ہندوؤں سے ہمارا کوئی تعلق نہیں پھر بھی وہ مسلمانوں کے خلاف آواز بلند کرتے اور ہندوؤں سے ہی اپنے تعلقات رکھتے ہیں۔ یہی حال دوسری اقوام کا ہے کہ وہ بھی ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف اپنی آواز بلند کرتی ہیں۔ آخر اس کی کوئی نہ کوئی وجہ ہونی چاہیئے۔ اگر اس وجہ کو تلاش کر کے دور کیا جاتا اور پھر تمام کمزور اور مظلوم اقوام کو اکٹھا کیا جاتا تو یقیناً ان کی آواز میں شدت پیدا ہو جاتی۔

پھر اگر مسلمانوں کی آواز مذہبی نقطۂ نگاہ سے یورپین ممالک میں نہیں سنی جاتی تھی تو مسلمانوں کو چاہیئے تھا کہ وہ مذہب کو کسٹم کے رنگ میں پیش کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہی بات جو یورپ، مذہب کے نام سے سننے کے لئے تیار نہیں تھا کسٹم کے نام سے سننے کے لئے تیار ہو جاتا اور اس کی معقولیت کو تسلیم کرتا۔ تم کسی یورپین کے سامنے مذہب کا ذکر کرو اور کہو کہ فلاں مطالبہ مذہبی نقطہ نگاہ سے ہمارے لئے اہمیت رکھتا ہے تو وہ کہے گا کہ یہ لغو بات ہے۔ لیکن اگر اسی کا نام تم رسم و رواج رکھ دو تو سارا یورپ کہنے لگ جائے گا کہ یہ بڑی معقول بات ہے۔

پس اگر وہ مذہب کی بجائے رسم و رواج نام رکھ لیتے یا طریقہ نام رکھ لیتے یا اقتصادی درستی کا اسے ایک ذریعہ قرار دے دیتے تو مَیں سمجھتا ہوں اس طریق سے سارے یورپ کو اپنے مطالبات کا قائل کیا جا سکتا تھا۔ مثلاً اگر یہ کہا جائے کہ گائے کی قربانی مذہبی نقطۂ نگاہ سے ہمارے لئے ضروری ہے تو سارا یورپ کہے گا یہ بالکل لغو بات ہے کیونکہ یورپ کے نزدیک مذہب کے نام پر کسی قسم کی قربانی ایک لغو حرکت ہے۔ پس اگر یہ مطالبہ کیا جائے کہ ہمیں قربانی کے لئے گائے ذبح کرنے کی اجازت ہونی چاہئے کیونکہ ہمارا مذہب ہمیں اس قربانی کی تعلیم دیتا ہے تو سارا یورپ کہے گا یہ لغو مطالبہ ہے۔ لیکن اگر اس بات کو اس رنگ میں پیش کیا جائے کہ مسلمان غریب ہے، اس کے پاس کھانے کے لئے گوشت نہیں ہوتا مگر اپنی صحت قائم رکھنے کے لئے مجبور ہوتا ہے کہ گوشت کھائے اور اس کے پاس سوائے گائے ذبح کرنے کے اَور کوئی چارہ نہیں۔ ہندو چاہتے ہیں کہ مسلمان کو نقصان پہنچے، ان کی صحتیں بگڑ جائیں اور انہیں کھانے کے لئے گوشت میسر نہ آئے تو سارے یورپ کے لوگ کہہ اٹھیں گے کہ یہ بڑی معقول بات ہے مسلمانوں کو گائے ذبح کرنے کی ضرور اجازت ہونی چاہئے۔ تو ذرا سی شکل بدل دینے سے پروپیگنڈا کی شکل بدل جاتی ہے۔ ایک شکل میں یورپ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، امریکہ اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا، انگلستان اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوگا لیکن اگر اسے دوسری شکل دے کر یہ کہنے لگ جاوے کہ ہماری دقتیں سیاسی دقتیں ہیں، ہماری دقتیں اقتصادی دقتیں ہیں، ہماری دقتیں تنظیمی دقتیں ہیں تو سارا یورپ ان باتوں کی قیمت دینے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ غرض اسلامی نقطہ نگاہ کبھی بھی سیاسی طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا۔ اقتصادی طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا، تنظیمی طور پر دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا گیا بلکہ مذہبی طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا گیا ہے۔ اور اس وجہ سے کہ ہمیشہ اس کو مذہبی رنگ میں پیش کیا گیا قوموں نے تھُو تھُو کرنا شروع کر دیا۔ یورپ اور امریکہ میں مسلمانوں کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ اسلامی ممالک میں بھی ان کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ لوگوں نے یہی سمجھا کہ یہ مولویوں کے جھگڑے ہیں ان کو کوئی اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ باوجود اس کے کہ کمیشن کے فیصلہ میں مسلمانوں کے

حقوق کو ایک حد تک تلف کیا گیا ہے۔ چاہے دانستہ تلف نہیں کیا گیا دنیا کی عام رائے کمیشن کی تائید میں ہی ہے مخالف نہیں۔ میری ذاتی رائے یہی ہے کہ کمیشن نے اپنی طرف سے یہ ضرور کوشش کی ہے کہ مسلمانوں کے حقوق کو ایک حد تک محفوظ کر دیا جائے مگر بوجہ اس کے کہ وہ تجاویز خود کمیشن کی سوچی ہوئی تھیں ان کی سکیم ویسی کارآمد نہیں جیسے وہ سکیم کار آمد ہو سکتی تھی جو خود مسلمانوں کی طرف سے پیش کی جاتی۔

چوتھا نقص جو مسلمانوں کی کوششوں میں واقع ہوا ہے یہ ہے کہ تمام قومیں مختلف تجاویز رکھتی ہیں تا اگر ایک تجویز ختم ہو جائے تو دوسری تجویز سامنے آ سکے جو پہلی تجویز کے قائم مقام ہو۔ اس وجہ سے کانگرس والے ہمیشہ ان لوگوں سے تعلقات رکھتے رہے ہیں جو ان کی پیش کردہ تجاویز سے نیچے اتر کر دوسرے نمبر کی سکیم پیش کر سکیں۔ چنانچہ کانگرس نے آزاد مسلم کانفرنس کے اراکین کو ہمیشہ اپنے ساتھ رکھا اور پھر خود کانگرس کے لیڈر ان کو اپنے ساتھ لے کر کیبنٹ مشن (Cabinet Mission) سے ملاقات کراتے رہے۔ اگر یہ لوگ کانگرسی نہیں تھے تو کانگرس والوں کو کیا شوق تھا کہ وہ ان کو اپنے ساتھ رکھتے اور کیبنٹ مشن سے ان کی ملاقات کراتے۔ صاف ظاہر ہے کہ کانگرس کا آزاد مسلم کانفرنس والوں کو اپنے ساتھ رکھنا اور ان کی کیبنٹ مشن سے ملاقات کرانا بھی اس غرض سے تھا کہ اگر کمیشن مسلمانوں کے متعلق ہماری سکیم نہ مانے تو دوسرے نمبر کی کوئی اَور سکیم کمیشن کے سامنے آجائے جو بہر حال اَور سکیموں سے بہتر ہو گی۔ مگر مسلم لیگ والوں کا شروع سے یہ رویہ رہا ہے کہ ہماری سکیم کے خلاف جو شخص بھی کوئی آواز بلند کرے گا خواہ وہ ہم سے ایک فیصدی اختلاف ہی کیوں نہ رکھتا ہو وہ کشتنی اور گردن زدنی ہو گا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب وزارتی کمیشن نے فیصلہ کیا کہ پاکستان اصل شکل میں مسلمانوں کو نہیں دے سکتے تو اس سے نیچے اُتر کر مسلمانوں کے فائدہ کے لئے ان کے سامنے کوئی سکیم نہیں تھی اور انہیں خود سوچنی پڑی۔ اور یہ ظاہر بات ہے کہ کمیشن کے ممبر مسلمانوں کے فائدہ کے لئے وہ کچھ سوچ نہیں سکتے تھے جو خود مسلمان اپنے فائدہ کے لئے سوچ سکتے تھے۔ اگر مسلم لیگ اپنی اس غلطی کا تدارک کرتی اور وہ ان لوگوں کو ہم آہنگ بنا لیتی جو گو پاکستان کی پوری طرح تائید کرنے والے نہیں تھے لیکن

سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے پاکستان سے نیچے اُتر کر بعض اَور ذرائع بھی ہو سکتے ہیں اور وہ ان ذرائع کو ایک سکیم کی صورت میں پیش کرتے یا مسلم لیگ ان کی آواز کمیشن تک پہنچا دیتی۔ تو کمیشن کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق خود کچھ سوچنے کی تکلیف گوارہ نہ کرنی پڑتی۔ ممبرانِ کمیشن سمجھتے کہ اگر مسلم لیگ کی سکیم کو ہم نے قبول نہیں کیا تو مسلمانوں کے ایک اَور طبقہ کی طرف سے پاکستان سے نیچے اُتر کر ایک اور سکیم ہمارے سامنے پیش کی جارہی ہے۔ آؤ ہم اس کو قبول کر لیں۔ اس طرح مسلمانوں کے حقوق موجودہ صورت سے بہت زیادہ محفوظ ہو جاتے یا کم سے کم وہ باتیں جو اَب مشن کے ذہن میں نہیں آئیں اس سکیم کے پیش ہونے کی صورت میں اس کے ذہن میں آجاتیں اور اس کے ممبر سمجھتے کہ مسلمانوں کے حقوق اس اس رنگ میں زیادہ محفوظ ہو سکتے ہیں۔ یہ طریق یقیناً زیادہ مفید ہوتا اور یقیناً اس کے نتائج مسلمانوں کے حق میں بہت بہتر ثابت ہوتے۔ کانگرس نے ہمیشہ یہ طریق استعمال کیا ہے اور ہمیشہ اپنی بغل میں ایک دشمن کو بھی رکھا ہے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ اپنی بغل میں کوئی دشمن نہیں رکھ سکتا اور اگر رکھتا ہے تو وہ ضرور اس کی کوئی سیاسی چال ہوگی کہ ظاہر میں تو اس کو دشمن قرار دیا جائے لیکن اندرونی طور پر وہ اس کا ہم خیال ہو اور اس کے منہ سے ایسی باتیں نکلوائی جائیں جو اس کو فائدہ پہنچانے والی ہوں۔ غرض کانگرس نے ہمیشہ یہ سیاسی چال چلی اور اس نے بعض لوگوں کو اپنے سے سوا ظاہر کر کے کمیشن کے سامنے پیش کیا تا اگر ان کی سکیم منظور نہ ہو تو وہ کہہ سکیں کہ اگر کانگرس مسلمانوں کے حقوق کے متعلق جو کچھ سکیم پیش کرتی ہے اُسے آپ منظور نہیں کر سکتے تو آزاد مسلم کانفرنس والے جو کچھ کہتے ہیں وہ مان لیا جائے۔ یہ تو نہ کانگرس میں شامل ہیں نہ مسلم لیگ میں۔ جو کچھ یہ کہتے ہیں وہی دے دیا جائے۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ درمیان میں رہنے والے نہیں تھے بلکہ کانگرس کے طرفدار تھے۔ اسی طرح مسلم لیگ کی طرف سے اگر یہ نہ کیا جاتا کہ جو شخص ذرا بھی مسلم لیگ کی سکیم سے اختلاف کرے گا اسے سوادِ مسلمین سے خارج قرار دیا جائے گا تو یقیناً اسلام اور مسلمانوں کے لئے یہ رواداری بہت زیادہ مفید ہوتی کیونکہ مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے اسلامی نقطۂ نگاہ پاکستان سے نیچے اُتر کر کمیشن کے سامنے آجاتا اور کمیشن کو خود اپنی طرف سے کوئی نیا نقطۂ نگاہ پیش نہ کرنا پڑتا جو

لازماً اتنا ہمدردانہ نہیں ہو سکتا جتنا ہمدردانہ وہ نقطۂ نگاہ ہو سکتا تھا جو خود مسلمانوں کے ایک طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا۔ غرض میرے نزدیک چار اہم غلطیاں ہیں جو مسلمانوں سے ہوئیں اور جن کا خمیازہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کب تک اور کن کن صورتوں میں اُنہیں بُھگتنا پڑے گا۔ ابھی تو باہم گفت وشنید کا سلسلہ جاری ہے اور نہیں کہا جاسکتا کہ اس کا کیا نتیجہ بر آمد ہو۔

اس مضمون کا دوسرا حصہ مَیں ابھی بیان نہیں کرتا کیونکہ وقت زیادہ ہو گیا ہے لیکن میرے نزدیک اب بھی اس فیصلہ میں بعض ایسی اصلاحیں کرانے کی کوشش کی جاسکتی ہے جن سے مسلمانوں کے حقوق بہت حد تک محفوظ ہو سکتے ہیں اور وہ خطرہ جو اِس وقت مسلمانوں کو درپیش ہے کم ہو سکتا ہے۔ فِی الْحال مَیں صرف اتنا ہی بیان کرتا ہوں کہ میرے نزدیک چار چیزیں ہیں جن کی مسلمانوں کو ضرورت تھی اور جن کی طرف عدمِ توجہ کی وجہ سے انہیں نقصان پہنچا۔ ضرورت تھی اس بات کی کہ مسلمان اپنا قومی کریکٹر مضبوط کرتے، ضرورت تھی اس بات کی کہ مسلمان غیر ممالک میں پروپیگنڈا کی اہمیت کو سمجھتے، ضرورت تھی اس بات کی کہ مسلمان سیاسی طور پر غیر قوموں سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کرتے اور ضرورت تھی اس بات کی کہ مسلمان اس امر کو سمجھتے کہ تھوڑا بہت اختلاف جو قوم میں شقاق اور افتراق پیدا کرنے کا موجب نہ ہو اس کا برداشت کرنا قوم کے لئے مُضِر نہیں ہوتا بلکہ ترقی کے لئے مفید ہوتا ہے۔ اب بھی مسلمان اگر ان امور کی اہمیت کو محسوس کر لیں تو آئندہ ان کے بچاؤ کی بہت کچھ صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آئندہ خطبہ جمعہ میں یا ایک علیحدہ مضمون کی صورت میں مَیں وہ امور بیان کروں گا جن کو مدنظر رکھتے ہوئے میرے نزدیک اب بھی وزارتی کمیشن کے فیصلہ میں ایک حد تک اصلاح کی صورت پیدا کی جاسکتی ہے۔" (الفضل 3 جون 1946ء)